بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج ہم اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟ سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیا کی بعثت اُن کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے لیکن کیا وہ آغاز کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں، یا شروع شروع میں ان کا تخاطب، قوم کے کسی خاص طبقے سے ہوتا ہے؟ اگر کسی خاص طبقے سے ہوتا ہے تو وہ کون ہے؟ عامۃ الناس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ الناس کی قیادت و رہنمائی کرتے ہیں؟ سوال کے دوسرے جز کا منشا یہ ہے کہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم، شروع شروع میں، اس کی دعوت سے بیگانہ بلکہ اس کی مخالف ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ سب کو منکر و کافر فرض کرکے اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ!"، "اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو" سے کرتے ہیں یا ان کا طرز خطاب کچھ اور ہوتا ہے؟ یہ دونوں سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعین کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور اپنا اور دوسروں کا صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطے سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہی یا داعی یا مدعو کا صحیح موقف متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی اور اصلاح کے بجائے اسی جڑ سے ایک نیا فساد اٹھ کھڑا ہوا۔

سوال کے پہلے حصہ کا جواب، اس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے، ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے ارباب اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اُس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار

کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے بیٹھا تھا (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۔ بقرہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں۔ (اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِیَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى) حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بنوخذ نصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، لوط علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور مستکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ وہ لوگ تھے جو عرب کی مذہبی حکومت کے ارباب حل وعقد تھے اور اس کے واسطہ سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے آپ نے "امتِ وسط" کو جو طریقہ بتایا وہ بھی یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطین عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ سلامت رہو گے ورنہ تمہاری اور تمہارے زیردستوں دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی"۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل وعقد دعوت عام کے باب میں، اسی طریقہ کی پیروی کریں۔ اور خلافت راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقہ پر تبلیغ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء اللہ علی الناس کی حیثیت سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے جس سے کوئی شخص، جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو، انکار نہیں کرسکتا لیکن ساتھ ہی اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن کے بام و در پر آفتاب ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے چمکتی ہیں تقدیر کی نیرنگی سے، قبول ہدایت میں سب سے پیچھے وہی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ، مدینہ کے کسان دور دور سے آتے ہیں اور داخل اسلام ہو جاتے ہیں لیکن قریش کے

اعیان و اکابر، ابو لہب، ابو جہل، امیہ بن صلت، اور مکہ و طائف کے اشراف، جن میں سے ایک ایک کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوت حق بلند کرتا ہے، اس برکت سے محروم رہتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ لوگ جن کی طرف دعوت کا خطاب براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ترتیب دعوت میں پیچھے ہوتے ہیں وہی لوگ قبول دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بات پوری ہو کے رہتی ہے کہ "کتنے ہیں جو آگے ہیں، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے ہیں وہ آگے ہو جائیں گے" ——— لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے اور عامۃ الناس کو اس وقت تک براہ راست مخاطب نہیں کرتے جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور اکابر و اعیان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کر دیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے شروع میں برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے لیکن جب ایک عرصہ کی جد و جہد کے بعد بھی ان کے کبر و غرور اور پندار سیادت کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے کے ماہی گیروں کے پاس گئے اور ان کو دعوت دی کہ "اے مچھلیوں کے پکڑنے والو! آؤ، میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بنا دوں" اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ان کو ایسے اہل ایمان دیے جو ان کے حواری کہلائے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۵۲ - آل عمران)

جب عیسیٰ نے ان کی (علمائے یہود کی) طرف سے کفر پر اصرار کو بھانپ لیا (اور عام لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا کون اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہیے کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

اس آیت میں ان کی اسی دعوت عام کا ذکر ہے جو انھوں نے علمائے وقت کی کفر و ہٹ دھرمی واضح ہو جانے اور ان کے قبول حق سے مایوس ہو جانے کے بعد عام لوگوں کے سامنے نہایت درد اور دل سوزی کے ساتھ پیش کی ہے، اور شاید اسی دل سوزی کا، جو لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے، یہ اثر

تھا کہ جس دعوت حق سے یروشلم کے پشتینی دیندار زچ ہوگئے اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے دعوت حق کے وہ خادم پیدا کیے جو بالآخر غالب اور فتحمند رہے۔ اسی بات کا ذکر سورہ صف میں بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ

اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو جس طرح کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے تو حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں تو ایک گروہ بنی اسرائیل میں سے ایمان لایا (حواریوں کا گروہ) اور ایک گروہ نے کفر کیا (علماء و سادات کے گروہ نے) پس ہم نے مدد کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے ان لوگوں کے خلاف جو ان کے دشمن تھے پس وہ لوگ غالب ہوگئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی پر نہایت موثر اور بصیرت افروز مثلیں بھی کہی ہیں لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ باوجودیکہ قبول دعوت میں سبقت وہی لوگ کرتے ہیں جو ترتیب دعوت میں موخر ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود حضرات انبیائے کرام جب تک وقت کے ذہین اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت تک عامۃ الناس کو براہ راست مخاطب نہیں کرتے۔

بعینہٖ یہی صورت حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی پیش آئی۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قریش کو دعوت دی جو سارے عرب کے دینی و سیاسی پیشوا تھے۔ اور ان کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب ان کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو ان کے قبول اسلام کے لیے آپ نے دعائیں بھی کیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعضوں کے نام لے کر بھی آپ نے

دعائیں کیں۔ مثلاً منقول ہے کہ آپ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ عمر یا ابو جہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے"۔ ان لوگوں کے قبول اسلام کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں نہ آپ کو اپنے ضروری آرام کا خیال تھا، نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا۔ بلکہ بسا اوقات یہ ذوق و شوق آپ پر اس قدر حاوی ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت سے بھی غفلت ہو جاتی جو نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود آپ انہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے اور ان کے ہر قسم کے طعن و طنز، تحقیر و استہزا، اور عناد و اختلاف کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن اس چیز کی ایک حد تھی جس کے بعد ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دینا اور ان کے پیچھے پڑنا خود دعوت کے وقار کے خلاف تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس حد پر پہنچنے کے بعد آپ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کی جائے تو، چونکہ وہ اس طرح کی بیماریوں سے محفوظ ہیں جن میں اقتدار و اثر رکھنے والے لوگ عموماً مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اس کو قبول کریں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو متکبرین سے اعراض کا حکم دیا گیا

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا اَنْتَ مَلُوْمٍ وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۴-۵۵ ذاریات)

پس ان (متکبرین) سے اعراض کرو اب تم کو کوئی ملامت نہیں ہے (کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا) اور نصیحت کرو (ان لوگوں کو جو داخلِ اسلام ہو چکے ہیں) کیونکہ نصیحت اہلِ ایمان کو نفع پہنچاتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس بات کے سبب کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمھیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے یا یاددہانی حاصل کرے تو یاددہانی اسے نفع پہنچائے۔ لیکن وہ جو بے پروائی کرتا ہے اس کے تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ اگر وہ پاکی نہ حاصل کرے تو تم پر اس کا الزام نہیں ہے۔ اور وہ جو تمھارے پاس ذوق و شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے اس سے تم غفلت برتتے ہو۔ ہرگز نہیں (ان متکبرین کی اس قدر پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے) یہ تو ایک یاد دہانی ہے سو جس کا جی چاہے اس کو حاصل کرے، بلند اور پاک صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوفا منشیوں کے ہاتھ میں۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۸۸ الحجر)

اور ان کفار کی بعض جماعتوں کو جس مال ومتاع سے ہم نے بہرہ ور کر رکھا ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور ان کی بدبختی پر غم نہ کرو اور اپنا دامن شفقت اہل ایمان پر ڈالو۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا اپنی دعوت میں یہ ترتیب اختیار کرنا محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے اس کے نہایت اہم وجوہ ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح وجہ تو یہ ہے کہ عوام الناس علم وعمل اور اخلاق وکردار میں ان لوگوں کے تابع ہوتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر واقتدار رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ الناس علی دین ملوکہم۔ لوگ ارباب اقتدار کے دین پر چلتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر ارباب اقتدار اصلاح قبول کرلیں تو عوام الناس تو بخود ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ اور اگر یہ بگڑے رہیں تو عوام الناس اولاً تو کوئی اصلاح قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کرتے بھی ہیں تو اس کا اثر بہت جلد اٹھ جاتا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرام امتیاز رکھنے والے طبقات (Privileged Classes) کے خلاف کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دلوں میں کوئی بیجا عصبیت ہوتی کہ وہ طبقاتی جنگ برپا کرکے مقدم الذکر کو پست اور موخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جو مشن دنیا میں لے کر آتے ہیں وہ ایک فساد کو دوسرے فساد سے بدل دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ پوری سوسائٹی کو خدا پرستی، اصلاح، رحم اور خوف آخرت کی اساس پر قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے اس وجہ سے عوام ہوں یا خواص وہ دونوں کو یکساں محبت وہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں طبقے بیماریوں سے پاک ہوکر صحت قبول کرلیں۔ البتہ علاج میں وہ اونچے طبقات کو اس وجہ سے مقدم رکھتے ہیں کہ درحقیقت انہی کی بیماریاں ہوتی ہیں جن کی چھوت سے دوسرے بیمار ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ان کے علاج کی فکر پہلے کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے علاج میں زیادہ زحمت نہ ہو۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا طریقہ ہے جو اونچے طبقات کے خلاف ایک معاشی تعصب یا انتقام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوام

کو ورغلا کر اپنا کام چلاتے ہیں جس کی بہترین مثالیں جمہوری اور اشتراکی انقلابات کی تاریخ میں موجود ہیں۔ یہ طریقہ طالبین دنیا کا ہے۔ اس کی بنیاد قطع رحم پر ہے۔ اس میں اصل محرک اصلاح کی جگہ انتقام کا جذبہ ہوتا ہے اس کا ہتھیار طبقاتی جنگ ہے۔ اور اس کا ثمرہ صرف یہ ہے کہ ایک فساد کی جگہ دوسرا فساد برپا ہو جائے۔ اس لیے حضرات انبیائے کرام اور صالحین نے اس طریقہ کو کبھی اختیار فرمایا نہ یہ ان کے شایان شان تھا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے وہی برتر ہوتا ہے۔ یہ ذہنی برتری ہی ان کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو ان سے اغماض نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیں تو اس کی اساس پر کسی بڑے سے بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک بڑی قیمت رکھتے ہیں اور ان کو ضائع کرنے میں اصلی نقصان خود ان کو نہیں بلکہ سوسائٹی کو پہنچتا ہے۔ اگر عوامی انقلاب برپا کر کے یہ ختم کر دیے جائیں تو پوری سوسائٹی بالکل اس دودھ کے مانند رہ جاتی ہے جس کا مکھن نکال لیا گیا ہو۔ ایسی سوسائٹی جب انقلاب کی ہسٹیریا سے فارغ ہو کر زندگی کی نئی تعمیر کے نقشے بناتی ہے تب اس کو اپنے دیوالیہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ اسے علانیہ نظر آتا ہے کہ آگے کے کاموں کے لیے جو ذہنی و فکری صلاحیتیں درکار ہیں ان صلاحیتوں سے ان کی فوج بالکل خالی ہے۔ روس کے پہلے انقلاب کے بعد بالکل یہی صورت پیش آئی تھی۔ انقلاب کے خاتمہ پر جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آئی وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اپنے نظریات پر حکومت کا انتظام کس طرح چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیل کر جو اقتدار انھوں نے حاصل کیا وہ اقتدار استعمال کے لیے انھیں انہی لوگوں کے حوالہ کرنا پڑا جن سے وہ چھینا گیا تھا۔ یہ لوگ ہنگامہ عام سے مرعوب ہو کر ان نئے نظریات کے آگے جھک تو ضرور گئے لیکن اپنے دل کے اندر ان کے خلاف سخت نفرت و عداوت چھپائے ہوئے تھے اس وجہ سے اس اقتدار کو انھوں نے مخلصانہ نہیں بلکہ منافقانہ قبول کیا اور ان کے ہاتھوں اس اشتراکی اقتدار کا حشر وہی ہوا جو کسی تحریک کا اس کو منافقانہ طور پر اختیار کرنے والوں کے ہاتھوں ہو سکتا تھا۔ انبیائے کرام علیہ السلام کا طریقہ دعوت اس قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت سب سے پہلے ذہین طبقہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں سے جو لوگ ذہانت کے ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دوچند ہو جاتی ہے۔ خیال کرو

فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام۔ یہ اسی طریق دعوت کی برکت تھی کہ اسلام کو حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق جیسے لوگ مل گئے جنھوں نے اپنی ذہانت کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کرلیا کہ وہ بذات خود اصل دعوت کے شارح و مفسر بن گئے اور اپنے کردار کی پختگی کی وجہ سے اپنے اندر وہ اپنے اپنی ہمت مردانہ رکھتے تھے کہ اس کی اساس پر ایک پورا نظام اجتماعی مرتب کرکے اس کو چلادیا اور دنیا کو دکھادیا کہ اسلام یہ کچھ چاہتا ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مادی اعتبار سے بھی بہتر ہوتا ہے۔ یہ مادی برتری فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس سے لازماً نفرت ہی کی جائے۔ اس کے اندر برائی کا اگر پہلو ہے تو یہ ہے کہ یہ باطل کی تائید و تقویت کا ذریعہ ہو۔ اگر باطل کے بجائے یہ حق کی تائید و تقویت کا ذریعہ ہو تو جس طرح سلیمان کی شوکت اور ذوالقرنین کی سلطنت ایک نعمت و برکت ہے اسی طرح ہر مادی برتری اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے ارباب جاہ کو حق کی دعوت دینے میں جو اس قدر انہماک تھا اس میں جہاں اور پہلو مدنظر تھے وہاں خاص طور پر یہ چیز بھی پیش نظر تھی کہ اگر یہ لوگ دعوت کو قبول کرلیں گے تو یہ جن مادی وسائل پر قابض ہیں وہ آپ سے آپ حق کی نصرت و اعانت کے لیے وقف ہوجائیں گے۔ اور اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ باطل کے ہاتھوں سے ایک بڑی طاقت چھن جائے گی بلکہ یہ طاقت، باطل کے خلاف لڑنے کے لیے حق کے ہاتھوں میں ایک تلوار ہوگی۔ ہر دعوت حق کا آغاز بے سروسامانی کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ وقت کے مادی وسائل و ذرائع ایجاد و اختراع کی قابلیتوں اور علوم و فنون کی طاقتوں کو جیت لیتی ہے اور ان کو جیت کر جب وقت آتا ہے باطل کے خلاف صف آرا کردیتی ہے۔ اس بات کو جس طرح ہر صاحب دعوت چاہتا ہے اسی طرح حضرات انبیائے کرام بھی چاہتے ہیں لیکن دوسروں میں اور انبیائے کرام میں یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں یہ چیز اس قدر اہمیت کبھی نہیں حاصل کرتی کہ اس کے آگے خود اصل مقصد غیر اہم ہوکے رہ جائے۔ اس وجہ سے جس منزل میں یہ خواہش اپنی اصلی حد سے متجاوز ہونے لگتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو روک دیتا ہے کہ تم ان کے مال و جاہ کی طرف نظر نہ اٹھاؤ تمھاری دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارا اور تمھاری دعوت کا خود کفیل ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ

أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَّحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ (طٰہٰ)

۵- پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصد دنیا میں ایک ایسے نظام حق کو برپا کرنا ہوتا ہے جو خدا کی بندگی، ایماندارانہ تنقید، بے رو رعایت احتساب، اور شوریٰ پر مبنی ہو نہ کہ شخصیت پرستی پر۔ اس وجہ سے وہ قدرتی طور پر سب سے پہلے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی طبیعت میں کم از کم اتنی بلندی تو ہو کہ وہ ہمیشہ اشخاص ہی کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی فکر و رائے کے پیچھے چلنے کی بھی ہمت رکھتے ہوں کیونکہ جن لوگوں کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس مقصد کے لیے بیکار ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرام آتے ہیں۔ یہ جوہر رکھنے والے اشخاص یوں تو ہر طبقہ کے اندر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن جواہرات کی تلاش بہرحال پہلے معدن ہی میں کی جاتی ہے نہ کہ مزبلہ پر۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کے آدمی چھانٹنے کے لیے حضرات انبیائے کرام پہلے سوسائٹی کے ذہین طبقہ ہی کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اصول و مقاصد کے بجائے اپنی شخصیتوں کی پرستش کرانا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ذہین طبقہ سے کترا کر عوام میں اپنی تحریک چلاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ سیاسی قابلیت اور ہمت رکھتے ہیں تو اپنی ڈکٹیٹرشپ[1] قائم کر لیتے ہیں اور اگر سیاسی قابلیت نہیں رکھتے یا ضعیف الہمت ہوتے ہیں تو بس ایک عوامی لیڈر ہو کے رہ جاتے ہیں اور اگر کچھ مذہبی روپ بھرنا جانتے ہیں تو ایک قسم کی پیری قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ذہین طبقہ سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح چور دن کی روشنی سے گھبراتا ہے۔

۶- چھٹی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سوسائٹی کے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر اس کے عوام سے کوئی تحریک شروع کی جائے تو عوام میں سے جو لوگ اس تحریک کو قبول کر بھی لیتے ہیں وہ شبہوں اور اندیشوں میں بلا ایک قسم کے احساس کمتری کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی کے اونچے طبقہ کے کچھ لوگ اس تحریک کے

[1] اس قسم کی تحریکات کا نتیجہ اگر کہیں جمہوریت کی شکل میں نمایاں ہوا ہے تو یا تو محض ظاہر فریبی ہے یا بعد کے فکری انقلاب کا نتیجہ ہے۔ ورنہ عام انسانوں سے اٹھنے والی تحریکیں لازماً شخصی استبداد اور ڈکٹیٹرشپ پر مبنی ہوتی یا عوامی لیڈرشپ پر یا پیری پر۔

ہمنوا نہ ہوجائیں اس وقت تک ان کے اندر اس کا وہ اذعان نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس کے اثر سے سرشار ہو کر اس کے لیے کوئی بازی کھیل سکیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے کہ وہ اگرچہ خود اس تحریک کے شکار ہو چکے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابھی ان لوگوں کو اس تحریک نے مفتوح نہیں کیا ہے جن کی ذہنی و مادی برتری وہ اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے کبھی تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قبول نہ کرنے والوں ہی کا قصور ہو سکتا ہے اور کبھی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے تحریک کے فلسفہ ہی میں کوئی ضعف ہو جو ان کو نظر آتا ہو اور ہماری نظر سے مخفی ہو۔ یہ تذبذب کی بیماری ان کو تحریک کے لیے بالکل بیکار بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اقرار کر کے بھی گویا انکار کرنے والوں ہی کی صف میں رہتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام کا طریقہ اس خامی سے بالکل پاک ہے۔ وہ شروع ہی میں ان لوگوں کے افکار و نظریات پر حملہ کرتے ہیں جن کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چلتا ہے اور کچھ دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ایک طرف وقت کے اخلاقی، سیاسی اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کو ذبح کر دیتے ہیں جو اس فلسفہ پر نظام اجتماعی کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ عوام الناس تقریباً غیر جانبدارانہ کر اس ساری کشمکش کو نہایت غور سے دیکھتے ہیں اور اندازہ کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں حق کس کی جانب ہے۔ بعض پر جو ذہین ہوتے ہیں، پہلے ہی مرحلہ میں واضح ہو جاتا ہے کہ حق یہ ہے اور وہ اس کو قبول بھی کر لیتے ہیں اور کچھ، جو ذہین نہیں ہوتے ایک عرصہ تک تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں لیکن جب یہ کشمکش اس مرحلہ میں پہنچتی ہے جس میں باطل اپنی حمایت اور حق کے ابطال کے لیے اوچھے ہتھیاروں کے استعمال پر اتر آتا ہے تو ان کے سامنے بھی جانب حق بالکل واضح ہو کر آجاتی ہے اور وہ بھی اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ عوام الناس کے یہ دونوں گروہ حق کو قبول کرنے میں کچھ آگے پیچھے ہوتے ہیں لیکن دونوں ہی اس کو علی وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اس احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے جس میں سابق الذکر گروہ مبتلا ہوتا ہے۔ ان کے دلوں پر سے حق کے مخالفین کا رعب بالکل اٹھ چکا ہوتا ہے۔ وہ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس اپنے رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی اور ضد کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کی مکاری، خود غرضی اور جعلسازی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پوری طرح

آجاتی ہے اس وجہ سے ان کی دیرینہ قیادت اور سابقہ عظمت کا احترام بھی ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ بصیرت ان کے اندر ایک احساس برتری پیدا کر دیتی ہے اور وہ "بڑوں" کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کے بجائے ان کے مقابل میں حق کی حمایت میں ایک غیر معمولی رفعت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کو ذہنی اور اخلاقی پہلو سے اتنا اونچا کر دیتی ہے کہ اگرچہ وہ بے سروساماں ہوں، اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہو، اگرچہ ان کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں، اگرچہ ان کے تیروں پر تکوں کی بجائے جست کی جاتی ہو لیکن بڑے بڑے غرق آہن سورماؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابل میں ان کو لا کر ان کے ذریعہ سے بدر کا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ ہر دعوت کی پائیداری کا اصلی جزء یہ ہے کہ ذہین اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں سے اس کے حاملین ملیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس کی عمر بہت کم ہو جاتی ہے اور اہل بدعت جلد اس میں رخنے پیدا کر کے ساری دعوت کو خراب کر دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق او پر گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء و اعیان میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ صرف عوام کے طبقہ سے ان کو کچھ شاگرد ملے ان شاگردوں کے اخلاص، تقویٰ اور ادائے فرض میں شبہہ نہیں لیکن اس کے باوجود پال نے بہت جلد دین مسیحی کو خراب کر ڈالا اور اپنے اس فساد میں اس نے جس چیز سے سب سے زیادہ کام لیا وہ اس کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ مسیح کے شاگرد غیر تعلیم یافتہ عوام میں سے ہیں، وہ مسیح کی تعلیمات کے اسرار و رموز کو کیا سمجھیں، وہ ان کے شاگردوں سے زیادہ ان کی باتوں کی حکمتوں کو جانتا ہے۔ اس کا یہ "پروپیگنڈا" اس قدر موثر ہوا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکا اور دین مسیحی نے بہت جلد ایک بالکل ہی مختلف شکل اختیار کر لی۔ اس کے برخلاف چونکہ اسلام کو قبول کرنے والے حضرت ابوبکر و عمر جیسے اذکیا تھے اس وجہ سے اہل بدعت اس میں آسانی رخنہ نہ پیدا کر سکے بلکہ جہاں تک کہ اسلام کی اصل دعوت کا تعلق ہے وہ ہزارہا انقلابات اور گردشوں اور اہل بدعت کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود آج تک جوں کی توں باقی ہے۔

یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے انبیائے کرام کا طریق دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے پہلے ذہین طبقہ

(باقی صفحہ ۳۰ پر)